بیگم انیس قدوائی بحیثیت خاکہ نگار

ڈاکٹر نشاز یدی

ڈی۔ال۔ایف۔کالونی صاحبہ آباد، غازی آباد

ملخّص:

بیگم انیس قدوائی ایسی باہمت خاتون کا نام ہے جنہوں نے خدمت خلق میں اپنے غم کا مداوا تلاش کیا۔انہوں نے ذاتی غم کو بھلا کر ان خواتین کے درد کو بانٹا جن کے دل ان کی طرح ہی ٹوٹے ہوئے تھے۔بیگم انیس قدوائی اردو کے مشہور ادیب مزاح نگار وانشائیہ نگار ولایت علی بمبوق کی بیٹی تھیں،ان کی شادی تحریک آزادی ہند کے مشہور سیاسی رہنما رفیع احمد قدوائی کے چھوٹے بھائی شفیع احمد قدوائی سے ہوئی تھی۔بیگم انیس قدوائی کے شوہر شفیع احمد قدوائی فرقہ وارانہ فساد میں ظالموں کے ہاتھوں مسوری میں 17 اکتوبر 1947 کو قتل کر دئے گئے تھے۔ایک عورت کے سر سے شوہر کا سایہ اٹھنا کس قدر اندوہناک ہوتا ہے لیکن بیگم انیس قدوائی نے ہمت سے کام لیا۔انہوں نے دوسروں کے غموں میں سہارا بن کر دوسروں کی مددگار بننے میں اپنے غم کا مرہم تلاش کیا۔مردولا سارا بھائی اور سوبھدرا جوشی کے ساتھ مل کر فسادات میں مغویہ عورتوں اور لاوارث بچوں کو تحفظ دینے کے لئے سینٹر قائم کئے۔اس طرح بیگم انیس قدوائی نے خود کو فلاحی کاموں کے لئے

وقف کر دیا۔انہوں نے جہاں ایک طرف سماجی خدمت میں خود کو مصروف کیا وہیں ادبی خدمات بھی انجام دیں۔ انیس قدوائی کی کتاب ''آزادی کی چھاؤں میں'' ان کے سماجی وفلاحی کاموں کے حوالے سے ہندوستان کی جدو جہد آزادی اور تقسیم ہند کے موضوع پر ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ کتاب افسانہ یا سنی سنائی کہانی نہیں، بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔ایسی حقیقت جس کی آگ میں انہوں نے خود کو جلتا ہوا محسوس کیا۔علاوہ ازیں بیگم انیس قدوائی نے انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری کے میدان میں بھی جوہر دکھائے اور مزاحیہ مضامین بھی لکھے ان کے خیال میں مزاح زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار حاصل کرنے کا کامیاب ذریعہ ہے۔ان کی تصنیفات ''آزادی کی چھاؤں میں''، ''نظرے خوش گذرے''، ''اب جن کے دیکھنے کو'' اور ''غبار کارواں'' اردو ادب میں اہم اضافہ ہیں۔بیگم انیس قدوائی نے اودھ کے قصبوں میں بولی جانے والی بامحاورہ زبان کا استعمال بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ان کے یہاں ہندی اور فارسی الفاظ کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔بیگم انیس قدوائی کے خاکے خاکہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہیں۔ان کے خاکوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے شخصیت کے مقام اور مرتبے کو نہیں، اس کے ساتھ اپنی ذاتی وابستگی اور تعلقات کو پیش نظر رکھا ہے۔

بیگم انیس قدوائی (1906-1982) ایسی باہمت اور حوصلہ مند خاتون کا نام ہے، جس نے سماجی اور ادبی خدمات کی بدولت اپنی شناخت قائم کی۔ انہوں نے جہاں ایک طرف مردولا سارا بھائی اور سوبھدرا جوشی کے ساتھ مل کر فسادات میں مغویہ عورتوں اور لاوارث بچوں کو تحفظ دینے کے لئے سینٹر قائم کئے وہیں اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ادبی میدان میں گراں قدر گراں قدر خدمات کے لئے انہیں حکومت ہند کی طرف سے ''ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ'' سے نوازہ گیا۔ ان کا تعلق بارہ بنکی کے مشہور نیشنلسٹ قدوائی خاندان سے تھا۔ ان کی شادی تحریک آزادی ہند کے سیاسی رہنما شفیع احمد قدوائی سے ہوئی تھی ،فسادات میں شوہر کے انتقال کے بعد وہ 1956ء سے 1968ء تک راجیہ سبھا کی ممبر رہیں۔ بیگم انیس قدوائی کے والد ولایت علی بمبوق اردو کے مشہور ادیب، مزاح نگار اور انشائیہ نگار تھے۔ بیگم انیس قدوائی نے بھی طنز ومزاح نگاری، انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ ان کی تصنیفات ''آزادی کی چھاؤں میں''، ''نظرے خوش گذرے''، ''اب جن کے دیکھنے کو' اور ''غبار کارواں'' اہم ہیں۔

انھوں نے خاکہ نگاری کے میدان اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ 1980 میں ''اب جن کے دیکھنے کو.....'' شائع ہوا۔ انیس قدوائی کے خاکے خاکہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کافی

حد تک کامیاب ہیں۔بیگم انیس قدوائی کے خاکوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے شخصیت کے مقام اور مرتبے کو نہیں،اس کے ساتھ اپنی ذاتی وابستگی اور تعلقات کو پیش نظر رکھا ہے،یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مولانا محمد علی جوہر، جواہر لال نہرو اور عابد حسین کے ساتھ ساتھ اپنے خاندانی نوکر حافظ جمن کی تصویر بھی کاغذ پر اتار دی ہے۔خاکہ نگار جب کوئی خاکہ لکھتا ہے یا خاکے کے لئے کوئی شخصیت منتخب کرتا ہے تو وہ کہیں نہ کہیں اس سے کسی بھی بنیاد پر متاثر ضرور ہوتا ہے۔بیگم انیس قدوائی نے انہی شخصیات کو موضوع بنایا ہے جن سے وہ علمی قابلیت،اخلاقی کردار،تدبر،خوش ذوقی،سماج سے محبت بھرا لگاؤ اور مذہبی عقیدت کے سبب متاثر ہوئیں۔یوں تو ان کے سبھی خاکے فن کاری کے اعلیٰ نمونے ہیں،مگر خصوصیت سے مولانا محمد علی جوہر،رفیع احمد قدوائی،مردولا سارا بھائی،چودھری محمد علی ردولوی،حافظ جمن اور ڈاکٹر سید عابد حسین کے خاکے ان کی فن کاری کے جاندار مرقعے ہیں۔اپنے مخصوص اسلوب میں مولانا محمد علی جوہر کا تعارف انہی کے ایک شعر سے اس طرح کراتی ہیں:

خوف غماز عدالت کا خطر دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوف خدا اور سہی

یہ تھے مولانا محمد علی- بے چین بلا کے ذہین، بے نظیر مقرر، مشہور صحافی ہوتے ہوئے قرون وسطیٰ کے مجاہدین اسلام کی تمام خصوصیات کا

مجموعہ اور ''بے خطر آتش نمرود'' میں کود پڑنے والے جذبۂ عشق سے
معمور-سوز وزیاں سے لاپرواہ ہوکر سچ بولنے کی ہمت وطاقت رکھنے
والے محمد علی-جن کی موت پر ایچ جی ویلز نے کہا تھا، ان کی زبان
برک کی زبان تھی اور ان کا دل نپولین کا دل تھا۔لیکن میں ان کے
بارے میں جانتی ہی کتنا ہوں۔صرف اتنا کہ وہ میرے والد کے
مخلص دوست تھے۔اور میری اوائل عمری میں مسلمانوں کے مقبول
ترین لیڈر تھے۔جب ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں علی برادران کا
طوطی بول رہا تھا اور وہ گاندھی جی کے دست راست بڑے بھائی تھے
۔
ان کی تقریریں، تحریریں، خطبات، کراچی کے مقدمے میں ان کے
معرکتہ الآرا بحث، موتمر اسلامی میں شاہ ابن سعود کے سامنے
اعلائے کلمتہ الحق اور گول میز کانفرنس لندن میں آخری زندۂ جاوید
الفاظ نے عقیدت واحترام کے جو جذبات پیدا کردئے تھے، آج
بھی یاد کرتی ہوں تو خون میں گرمی پیدا ہوجاتی ہے۔(اب جن کے
دیکھنے کو از بیگم انیس قدوائی، ص۔30، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سنہ
اشاعت۔1980)

محمد علی جوہر ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جن کے دل میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور محب وطن کا خون ان کی رگوں میں پیوست تھا، ان کے حب الوطنی کے جذبہ سے خاکہ نگار کافی متاثر نظر آتی ہیں۔بیگم

انیس قدوائی نے محمد علی جوہر کی شخصیت کا باریکی سے مطالعہ کیا ہے اور ایک ایک چیز کو بیان کیا ہے۔محمد علی جوہر کی تعلیم اور ان کے وطن پرستی کے بارے میں اس طرح لکھتی ہیں:

''بحیثیت مسٹر محمد علی کے زندگی کی ابتدا انہوں نے رام پور کے قیام، آکسفورڈ کی تعلیم، بڑودہ میں ملازمت، کامریڈ کی ایڈیٹری اور مہاراجہ محمود آباد کی دوستی سے کی۔شاعر ہوتے ہوئے بھی وہ مدح وستائش کے خوگر نہ بن سکے۔ملک کے صف اول کے لیڈر بن کر بھی وہ ''وبائے عام'' کا شکار نہ ہوئے۔صحافت میں سچائی و بے باکی کی بنیاد ڈالی اور سیاست کے اکھاڑے میں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔افلاس کسی کے سامنے گردن نہ جھکائی۔سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے مسلمان ہونے اور کہنے پر انہیں کبھی شرم نہیں آئی، بلکہ فخر رہا اور وطن پرستی بھی ان کا جزو ایمان رہی۔'' (ایضاً،ص۔30)

خاکہ نگار نے محمد علی جوہر سے پہلی ملاقات کی جو تصویر کشی کی ہے وہ بہترین ہے۔اس سے ان کی شگفتگی مزاج اور افتادطبع کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔یہ جاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی کہ بیگم انیس قدوائی کی ملاقات ایک ایسی شخصیت سے ہو رہی ہے جو منفرد ہے اور اس کی رگ رگ میں حب الوطنی کا خون جوش مار رہا ہے اس کا دل حب الوطنی کے جذبہ سے معمور ہے۔مصنفہ نے اپنے موضوع کی ایک ایک خوبی کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی وابستگی اور ان کی شخصیت سے متاثر ہونے کی وجہ بھی

بیان کی ہے:

''میں نے پہلی بار انہیں 1914ء میں اس روز دیکھا تھا جب بارہ بنکی میں ہمارے ضلع کی تمام قابل ذکر ہستیاں جمع ہو کر ''انجمن خدام کعبہ'' کی بنیاد ڈال رہی تھیں۔ میرے والد انتہائی مصروف تھے ۔ بچوں کو اس مجمع میں گھسنے کی اجازت نہ تھی، کیوں کہ وہاں زوردار مباحثہ جاری تھا۔ لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح دیکھ ہی لیا۔ سرخ سپید رنگ، اونچا قد، فربہی کی طرف مائل جسم، سیاہ کلیباک ٹوپی پر ہلال اور شیروانی پر ''خادم کعب'' کا بیج لگائے ہوئے۔ کیا بتاؤں وہ کتنے شاندار لگ رہے تھے، اور تب ایک بیج مانگ کر میں نے اپنی اوڑھنی پر ٹانک لیا۔'' (ایضاً، 30)

مصنفہ نے جہاں محمد علی کے چہرہ، مہرہ اور قد و خال، اپنی وابستگی کا ذکر کیا ہے وہیں ان کے خاکے سے اس دور کے سیاسی حالات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی خاکہ نگار کا قلم اتنا رواں ہوتا ہے کہ وہ سنے سنائے واقعات بھی اس روانی سے بیان کر دیتا ہے کہ جیسے اس نے یہ سب دیکھا ہو۔ بیگم انیس قدوائی نے بھی اس خاکے میں کچھ واقعات اپنے بزرگوں سے سن کر ہی رقم کیے ہیں اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے لیکن قاری کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا ہے کہ یہ واقعات انہوں نے سن کر بیان کیے ہیں۔

خواتین کے خاکوں کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ہر چیز تفصیل سے بیان کرتی ہیں اس لئے کہیں کہیں موضوع سے بھٹک بھی جاتی ہیں۔ بیگم

انیس قدوائی نے محمد علی جوہر کے خاکے میں تفصیل سے کام لیا ہے لیکن وہ ان تفصیلات میں اتنی کھو گئی ہیں کہ وہ بعض جگہ موضوع سے ہٹ جاتی ہیں اور اپنے متعلق تفصیلات بتانے لگتی ہیں اور ان کو اس بات کا احساس بھی جلد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتیں۔

بیگم انیس قدوائی کی خاکہ نگاری کا یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے کہیں بھی مشکل الفاظ کا استعمال نہیں کیا بلکہ بڑی سادگی سے اپنے موضوع سے متعارف کرایا ہے۔ رفیع احمد قدوائی کے تعارف کے لئے وہ الفاظ کا بے جا استعمال نہیں کرتی ہیں:

''کوئی کہتا ہے رفیع صاحب بہت بڑے سیاست داں تھے، کسی نے ان کو انسان دوست کہا، کچھ لوگ ان کی انتظامی صلاحیتوں کے قائل ہیں اور کچھ ان کی عقل اور تدبیر کے۔ لیکن مجھے تو ان کے ذکر پر خواجہ عثمان ہارونی کا قول یاد آتا ہے۔

''شفقت آفتاب کی سی، سخاوت دریا کی طرح اور انکساری زمین کے مثل۔ جب کسی میں یہ تینوں صفات دیکھو تو سمجھ لو اللہ تعالیٰ اسے دوست رکھتا ہے۔''

اور ایسی ہی ایک بھرپور شخصیت تھی رفیع احمد قدوائی کی، جس کی ابتداء 18/فروری 1894ء کو چھوٹے سے گاؤں مسولی میں ہوئی اور 24/اکتوبر 1954ء کو حیات مستعار کا اختتام ہو گیا۔ ایک حقیر فانی انسان جس نے اپنی زندگی کے 59 سال اس دنیا میں گزارے مگر

ایسے گہرے نقوش چھوڑ گیا کہ زمانہ لاکھ بھلانے کی کوشش کرے ہر
نقش ابھرا بھر کر انسانیت، شرافت، فیاضی، دردمندی اور حب الوطنی
کی داستان سناجاتا ہے۔'' (ایضاً، ص۔17)

خاکہ نگار نے اپنے موضوع کا مختصراً تعارف کرانے کے بعد اس دور کا احاطہ کیا ہے:

''وہ ایک ہنگامہ خیز دور تھا، جس میں عمر کے تیرہ سال جیل میں کٹ
گئے۔ بار بار کی گرفتاری، سزایابی، مشکلات، رکاوٹیں اور ان سب پر
مستزاد دل کی بیماری۔ سوا اس کے اور کیا کہوں کہ کوئی غیبی قوت تھی
جو انہیں زندہ رکھ کر ان سے کام لے رہی تھی اور طاقت عمل عطا کر رہی
تھی۔'' (ایضاً، ص۔18)

رفیع احمد قدوائی کے دور کا مختصراً احاطہ کرنے کے بعد قدوائی خاندان کی پوری تاریخ بیان کی ہے کہ وہ کہاں سے آئے اور ان کے آبا واجداد کون ہیں۔ مصنفہ نے رفیع احمد کے خاندان اور ان کی شخصیت کی خوبیوں کو فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

مصنفہ نے رفیع احمد قدوائی کے شب و روز کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت مصنفہ کی نظر میں ایک ایسے انسان کی ہے جس میں کوئی کمی نہیں بلکہ مکمل طور پر وہ فرشتہ صفت نظر آتے ہیں۔ انسان کی فطرت ہوتی ہے کہ جس کو وہ پسند کرتا ہے یا اس سے کوئی قریبی رشتہ یا لگاؤ

ہوتا ہے تو اس میں اس کو کوئی برائی نظر نہیں آتی یہی وجہ ہے کہ مصنفہ نے رفیع احمد قدوائی کی خوبیوں کو تفصیل سے قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ رفیع احمد کی شخصیت پر اس طرح روشنی ڈالتی ہیں:

''بعض لوگ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں، اس لئے بڑے آدمی کہلاتے ہیں۔ بعض بڑے آدمی بننے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ بڑے نہیں ہوتے مگر ان پہ بڑائی لادی جاتی ہے۔

رفیع صاحب ان تینوں قسموں میں سے کسی میں بھی فٹ نہیں ہوتے۔ وہ قدوائیوں کے ایک معزز خوش حال گھرانے میں ضرور پیدا ہوئے مگر اس وقت جب زمینداری آہستہ آہستہ مہاجنوں کے قبضے میں جا رہی تھی اور بڑے بننے کی کوشش یوں نہیں کر سکے کہ دادا، باپ اور چچا اپنی شرافت و قابلیت اور اہلیت و انصاف کا سکہ جمائے ہوئے تھے۔ بڑے بیٹے کی سب سے بڑی اولاد ہوتے ہوئے بھی دس سال تک ان کے ساتھ عام لڑکوں کا برتاؤ ہوا۔ انہیں اکثر تنبیہہ تادیب کا نشانہ بننا پڑا۔ کیوں کہ بگڑے رئیسوں نواب زادوں کے ڈھنگ دیکھ کر بزرگ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ ان اثرات سے بچانے کے لئے شاید ان پر ضرورت سے زائد پابندیاں عائد کی گئیں۔

لیکن جب چچا (ولایت علی صاحب) وکالت پاس کر کے علی گڑھ سے

لوٹے تو ان کی مردم شناس نظر نے بھتیجے کے غیر معمولی عادات واطوار
اور صلاحیتوں کو پرکھا اور خاص توجہ ان پر مرکوز کر دی۔
باپ حکومت وقت سے وابستہ اور تحصیل دار تھے۔ چچا باغیانہ ذہن
ودماغ رکھنے والے، قومی تحریکات میں منہمک تھے۔ ان دو متزاد
اثرات کے درمیان رفیع صاحب کو اپنی راہ ڈھونڈنی پڑی۔
ویسے اپنے تمام ہم عمروں میں انفرادی کردار رکھتے تھے۔ گہری
خاموشی کے ساتھ دلچسپ شرارتیں ضرور تھیں مگر چند خصوصیات کی بنا
پر نوعمر گروہ بھی ان کا احترام کرتا تھا۔ مثلاً ان کی شرم وحیا، جو شاید
میرے کام کیا میرے خیال کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ سچائی کا یہ
عالم تھا کہ صبر وسکون سے اپنی اور دوسرے کی غلطی پر سزا بھگت لیتے
مگر دوسرے کے سر الزام تھوپ کر یا اس کا راز فاش کر کے اپنے کو
بچانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ (ایضاً، ص۔20)

مصوری خاکہ خاکہ نگاری کا اہم وصف ہے اور اس وصف کا بیگم انیس قدوائی نے چابکدستی سے فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ وہ خوبیوں کو بھی بیان کرتی ہیں اور کمزوریوں کو بھی شخصیت کا اہم پہلو گردانتی ہیں۔ وہ اپنے موضوع کی زیادہ تفصیل بیان نہیں کرتیں بلکہ تعارف ہی کچھ اس انداز سے کراتی ہیں کہ وہ شخصیت آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل ہمارے قریب ہو۔ چودھری محمد ردولوی کا تعارف اس

انداز سے کراتی ہیں:

''سرخ وسپید رنگ، خوب گھنی سیاہ بڑی بڑی مونچھیں، ململ کا
کرتا۔ اس پر انگرکھا۔ بڑی مہری کا لٹھے کا پاجامہ کبھی شیروانی اور
چوڑی دار پاجامہ۔ ایک شاندار ملازم ساتھ، لڈوؤں کی ہانڈی ساتھ
، شراب کی بوتلیں اور سوڈے کا کیس تھامے ہوئے۔ بڑے بے
تکلفانہ انداز میں پھاٹک سے داخل ہوتے۔ ان کی غیر معمولی شوخی
وظرافت اور کھلے ہوئے ہاتھ کی بدولت بچوں، بوڑھوں اور
نوکروں سبھی کو ان کی آمد کی خوشی ہوتی۔ بزرگوں تک کو تحفہ تحائف سے
نوازتے، نوکروں پر انعام واکرام کی بارش ہوتی اور بچے مٹھائی کی
ہانڈیاں فوراً چک لیتے۔'' (ایضاً، ص۔53)

چودھری محمد ردولوی مصنفہ کے والد کے دوست تھے اور ان کے یہاں سے تعلقات بہت قریبی تھے۔ مصنفہ نے خاکے میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ان کے خاکوں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ جس شخصیت کو موضوع بناتی ہیں تو ان کا دل چاہتا ہے کہ وہ اس شخصیت کے بارے میں پوری پوری معلومات قاری تک پہنچا دیں اس کے لئے انہیں چاہے قیاس آرائی سے کام لینا پڑے یا بزرگوں سے مدد لینا پڑے یا پھر سنے سنائے قصوں کو کھنگالنا پڑے مگر معلومات تفصیلی ہوں۔ محمد علی ردولوی کا خاکہ لکھتے وقت بھی انہوں نے نہ صرف محمد علی سے متعلق تفصیلات بیان کیں بلکہ ان کے ماں باپ سے متعلق باتیں بھی رقم کی ہیں۔ لیکن یہ تفصیلات ایسی ہیں کہ قاری

بوجھل نہیں ہوتا بلکہ محظوظ ہوتا ہے:

''سنتی ہوں، ردولی کی دو حسین ترین بیگمات میں سے ایک ان کی والدہ تھیں۔ حالانکہ میں نے جب دیکھا ضعیف ہو چکی تھیں اور حلیہ بدل چکا تھا۔ بس آثار کہہ رہے تھے کہ عمارت عظیم رہی ہوگی۔ بڑے کلے ٹھلے کی بیوی تھیں۔ انیسویں صدی کے دل پھینک تعلقدار کی ان گنت محبوباؤں کے ہوتے ہوئے بھی بیگم کا رعب و دبدبہ اور عزت واحترام مثالی تھا۔ ایک واقعہ ان ہی لوگوں کی زبانی سنا ہوا یاد ہے کہ تعلقدار مرحوم کا قاعدہ تھا کہ بیگم کو خوش کرنے اور راضی بہ رضا رکھنے کے لئے اکثر نفیس زیورات اور ملبوسات تحفہ میں دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر اگر بائی صاحبان کے لیے کوئی زیور خریدتے تو بالکل اسی طرح بیگم کے لئے بھی آتا۔ یوں چاندی سونے کی بارش کر کے بیوی کے غیظ وغضب کو ٹالا کرتے تھے۔'' (ایضاً، ص۔54)

مصنفہ نے اپنے موضوع کے پورے خاندان کے بارے میں تفصیلات بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہیں ایک طرح سے پوری تہذیب کو قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے اور قاری مہذب لوگوں سے روشناس ہوتا ہے۔ چودھری محمد علی ردولوی ایک عہد ایک تہذیب کا نام ہے ۔ان کے خاکے کی یہ خوبی ہے کہ مصنفہ نے ان کی شخصیت کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ان کی زندگی کے مزاحیہ قصوں کو چابکدستی سے بیان کیا ہے اور یہ قصے اس خاکے میں جہاں چار چاند لگاتے ہیں، وہیں محمد علی کی مزاحیہ

طبیعت سے بھی روشناس کراتے ہیں اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ چودھری محمد علی نے جہاں بہت سے سنجیدہ فلاحی کام کئے وہیں وہ ایک خوش مزاج اور زندہ دل انسان بھی تھے اور تعلیم نسواں کے زبردست حامی بھی ۔یہی وجہ ہے کہ جس دور میں خواتین کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا، انہوں نے اس وقت اپنی بیٹیوں کو اسکول میں داخل کرایا۔خاکہ نگار نے اس پہلو پر اس طرح بات کی ہے۔

''مولانا کرامت علی نے اسکول کھولا تو پہلی لڑکیاں محمد علی چچا کی داخل ہوئیں۔میرے والد کو شاید وہ راضی نہ کر سکے اس لئے میری حسرت پوری نہ ہوسکی۔دو ہی سال کے اندر ماں نے آفت مچادی اور دونوں لڑکیاں واپس بلائی گئیں۔۔تب ان کی تعلیم کے لئے ایک حسین نوجوان انگریز لیڈی کا تقرر ہوا، جو انہیں لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھاتی تھی۔

لڑکیاں تو برائے نام تعلیم حاصل کر سکیں مگر چچا کے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ چچی کو اندیشہ پیدا ہو گیا اور والدہ تو شمشیر برہنہ ہو گئیں۔ناچار ٹیچر صاحبہ کو رخصت کرنا پڑا۔(ایضاً،ص۔58)

بیگم انیس قدوائی ایک خاکے میں شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔خاکوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جس شخصیت کا خاکہ لکھا جائے وہ شخصیت غالب رہے لیکن بیگم انیس قدوائی کے خاکوں میں بعض اوقات متعلقہ شخصیات غائب ہوجاتی ہے اور وہ موضوع

سے ہٹ کر تفصیلات بیان کرنے لگتی ہیں۔ چودھری محمد علی ردولوی کے خاکے میں جہاں انہوں نے شخصیت کے کئی پہلوؤں پر بات کی ہے وہیں محمد علی کے عاشقانہ مزاج سے متعارف کرایا ہے یہ بات اس انداز میں بیان کی ہے کہ مزاح کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، اسی طرح کا ایک یہ اقتباس دیکھیں:

''بیوی بڑی خدا ترس اور مرنجاں مرنج اور مذہبی تھیں۔ حج کو جانے لگیں تو چچا بمبئی تک چھوڑنے گئے۔ جدائی کے وقت بیوی کے آنسو نکل پڑے۔ پھر کیا تھا۔ دوڑ دھوپ کر کے جہاز میں جگہ حاصل کی اور خود بھی حج کو روانہ ہو گئے۔ یہ خبر سن کر سب حیران رہ گئے۔ واپس آئے تو ہم نے کہا۔ چچا آپ اور حج۔ یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔ کہنے لگے یہ بیوی تھی جو مجھے اس دربار میں لے گئی۔ مگر مدینہ پہنچ کر دل بہت ہی خوش ہوا۔ بے حد لطف آیا۔ (ایضاً، ص۔59)

اس خاکے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چودھری محمد علی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے حق پرست تھے اور تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے، جہاں ان میں یہ تمام خصوصیات تھیں وہیں وہ بلا کے حسن پرست تھے اور خواتین کے لئے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہ تھا کہ وہ بیوی کے وفادار نہیں تھے یا عشق بازی چھپ کر کرتے تھے بلکہ صدق دل سے اپنے عشق کا اعتراف بھی کرتے تھے اور بیوی کے حکم کے آگے سر خم کئے رہتے تھے۔ مصنفہ نے اس خاکے میں محمد علی کے

دونوں پہلوؤں سے روشناسکرایا ہے کہ وہ جہاں دل پھینک اور عاشق مزاج انسان تھے وہیں عورتوں اور لڑکیوں کا احترام بھی خوب کرتے تھے اور ان کی عزت کے لئے بھی لڑ پڑتے تھے۔ اور اپنے خاندان کی لڑکوں کو وفاداری کا درس دیتے تھے۔ چنانچہ وہ بیک وقت صوفی منش بھی تھے اور رنگین مزاج بھی۔ مصنفہ ایک نظر میں ان کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر اس طرح کرتی ہیں:

''بلا کے ذہین، غیر معمولی خوش مزاج، کھلا ہوا دل، کھلا ہوا ہاتھ، وسیع مطالعہ اور زندگی کا بھرپور تجربہ، کونکہ انہوں نے جی بھر کر زندگی سے لطف اٹھایا تھا، بلا کسی دغدغے، کھٹکے کے زندگی کی بہاروں کا بہاروں میں ہر پھول سے رس نچوڑا تھا۔
اور پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ وقت نے چہرے پر اپنے نشان ثبت کر دینے شروع کر دیے۔ سیاہی سفیدی سے، سرخی تانبے اور اعضا کی توانائی فالج کی مار سے بدلی۔'' (ایضاً، ص۔60)

یہ خاکہ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ چودھری محمد علی ردولوی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ انسان جب عمر کے آخری پڑاؤ پر ہوتا ہے تو اسے زندگی سے ناامیدی ہوجاتی ہے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کی رنگیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر چہ محمد علی نے زندگی سے خوب لطف اٹھایا اور بھرپور زندگی بسر کی۔ اور جب ان کا بڑھاپا آیا تو بھی زندگی سے مایوسی اختیار

نہیں کی حالانکہ ان کے بچے پاکستان چلے گئے تھے اور بیوی کا انتقال ہو گیا تھا بچے اپنی دنیا میں مصروف ہو گئے تھے انہوں نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے ایک جوان عورت سے نکاح کر لیا تھا۔ مصنفہ ان کے نکاح کا قصہ اس طرح بیان کرتی ہیں:

''پہلی بیوی کے انتقال کو عرصہ ہو گیا تھا۔ مگر ایک دن سج بن کر باہر نکلے تو ایک کاشت کار نے ٹوکا۔ چودھری صاحب کیا بیاہ کرنے والے ہو اور پھر سچ مچ انہوں نے ایک جوان عورت سے نکاح کر لیا۔ ایک بار لکھنؤ آئے تو کہنے لگے۔ بھئی میں تو بڈھا ہوں اور یہ ہیں بالکل جوان۔ اس لئے وجو (میرے بھائی) دیکھو اگر نہ رہوں، تو تم ان کی سرپرستی کرنا۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ہائے چچا چوٹی کتیا اور جلیبیوں کی رکھوالی۔ محمد علی چچا بہت محظوظ ہوئے۔ جا کر سب لڑکیوں کو بتایا۔ کہ آج انیس نے یہ جملہ کہا ہے۔ مگر قیصر (ان کی نئی بیوی) رو دیں۔ انہوں نے بہت شکایت کی کہ تم نے میرے لئے ایسا کیوں کہا۔ (ایضاً، ص۔61)

بیگم انیس نے پورا خاکہ بڑے دلچسپ پیرائے میں تحریر کیا ہے اور شخصیت کی زندگی سے متعلق ایک ایک مزاحیہ قصہ بیان کیا ہے اور چودھری محمد علی ردولوی کو اس طرح متعارف کرایا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود ان سے ملا ہے اور واقعات کے بیان میں اتنی روانی ہے کہ قاری کو محسوس

ہوتا ہے کہ یہ سب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور کانوں سے سن رہا ہے۔آخر میں خاکہ نگار اپنے موضوع کی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے ادبی پہلو پر روشنی اس طرح ڈالتی ہیں:

'' عجیب باغ و بہار شخصیت تھی۔خالص جاگیرداری ماحول کی پیدا وار۔نہ اب کسی کو اتنے مواقع ہیں نہ فرصت۔اس لئے میں نے سوچا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کردوں۔کیوں کہ اس دور میں نہ ایسی شخصیتیں بنیں گی، نہ ان کی ضرورت ہے۔ایک بات اور بتا دوں۔بوالہوسی سے سخت نفرت کرتے تھے اور فن کارانہ عیاشی کو آرٹ سمجھتے تھے اور اپنا پیدائشی حق۔

خدا مغفرت کرے۔جب تک جیے خوش رہے۔دوسروں کو خوش رکھا اور سب کو خوش دیکھنا پسند کیا۔آخر میں فالج سے معذور ردولی میں بیٹھ رہے تھے۔بچے سب پاکستان چلے گئے تھے۔دو چھوٹے لڑکے پاس تھے۔اس میں ایک خبط الحواس تھا۔دوسرا ابھی پڑھ رہا تھا۔اس وقت وہی ردولی میں ان کا نام لیوا ہے۔بڑی حسرت وغم سے پاکستان جانے والے لڑکے لڑکیوں کو یاد کرتے تھے۔

محفلوں کی رونق، جلسوں کے صدر نشین، دوستوں کے محبوب اور مذہبی حلقوں سے برسر پیکار یہ تھے محمد علی چچا!

وہ صاحب طرز ادیب اور افسانہ نگار بھی تھے افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ ان کے نام کو زندہ رکھنے والی متعدد کتابیں بھی

ہیں۔مثلاً اتالیق بیوی،صلاح کار، حیات کرامت حسین،میرا
مذہب اور کشکول محمد علی شاہ فقیر وغیرہ آرٹ کی پرکھ پر ایک مختصر سا
کتابچہ ''نقادی کے نکتے'' کے نام سے اور دوسرا فیملی پلاننگ
پر ''پردے کی بات'' کے نام سے لکھا تھا،اگر چہ اس وقت فیملی پلاننگ
کا کسی کو خیال بھی نہ آیا تھا۔''گویا دبستان کھل گیا'' کے نام سے ان
کے خطوط کا مجموعہ ان کی بیٹی ہما بیگم نے،ان کی زندگی ہی میں لاہور
پاکستان سے شائع کیا تھا۔''(ایضاً،ص۔62)

اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ بیگم انیس قدوائی نے چودھری محمد علی ردولوی کی شخصیت کو پوری طرح صفحۂ قرطاس پر اتار دیا ہے۔مصنفہ نے نہ صرف ان کی شخصیت سے روشناس کرایا ہے بلکہ عادات و اطوار،طور طریقے،ان کے آباؤ اجداد،اس دور کا سرمایہ دارانہ نظام ہر چیز سے روشناس کرایا ہے۔انہوں نے چودھری محمد علی ردولوی کے ساتھ ساتھ ردولی کے ماحول کی بھی عکاسی کی ہے۔زبان بھی خاکہ نگار نے خوب استعمال کی ہے اور محاوروں کا بھی بروقت استعمال کیا ہے۔

بیگم انیس قدوائی نے ہندوستان کی علمی،ادبی اور سماجی شخصیتوں کے کئی خاکے لکھے ۔ان کے خاکوں میں سوانحی رنگ گہرا ہوتا ہے۔ وہ خاکے کی ابتداء میں ہی شخصیت کا تعارف کچھ اس طرح کراتی ہیں کہ قاری کے سامنے اس کا چہرہ گھومنے لگتا ہے۔مرد ولا سارا بھائی کا حلیہ

صفحۂ قرطاس پر اس طرح اتارتی ہیں:

''کھدر کے دو جیبوں والے کرتے کٹے ہوئے
بال، پیشاوری چپل اور شلوار والی مردولا کو بھائی بہن ''باس
'' کہتے تھے۔حتیٰ کہ بعض وقت ان کے والد انبالال سارا
بھابھائی ہنس کر انہیں باس کہہ دیا کرتے تھے۔ساتھی
انہیں 'پٹھان' کہتے اور لوگ طنزاً 'مرداللہ' بھی کہا کرتے
تھے۔اور آخری دور میں تو ایسے ایسے خطابوں سے نوازی
گئیں کہ سن کر خون کھول جاتا تھا۔وہ سنتیں، پڑھتیں، مگر
بالکل بمبئی والوں کے لہجے میں یہ کہہ کر ٹال جاتیں ''ایسا ہی
چلتا ہے۔'''اس دنیا میں یہی ہوتا ہے۔''(ایضاً،ص۔86)

مردولا سارا بھائی ایک مجاہد آزادی تھیں انہوں نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ساری زندگی انہوں نے وطن کے لئے سچے جذبہ کے ساتھ جدوجہد کی۔مردولا سارا بھائی کم عمری سے ہی کانگریس تحریک میں شریک ہوگئی تھیں۔امیر گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود وہ آشرم میں رہیں سارا عیش وآرام چھوڑ کر سادگی سے زندگی گزاری اور ملک کی خدمت کی۔کئی مرتبہ وہ جیل بھی گئیں لیکن انہوں نے سچائی کا راستہ نہیں چھوڑا۔بیگم انیس قدوائی ان کے وطن پرستی کے جذبہ سے بہت متاثر تھیں مردولا ان کی ایسی دوست تھیں،جس نے ستائس سال تک دکھ سکھ میں ان کا ساتھ دیا یہی وجہ ہے کہ مردولا کے دنیا سے چلے جانے کا بیگم انیس

کو بہت غم ہوا اور ایسا لگا کہ جیسے کوئی سگا رشتہ دار دنیا سے اٹھ گیا ہو اور اس غم کو دور کرنے کے لئے انہوں نے قلم کا سہارا لیا اور اپنی دوست کا ایک بہترین خاکہ لکھا جس سے کہ قارئین بھی سارا بھائی کی قربانیوں سے واقف ہو جائیں۔ مصنفہ مردولا کی شخصیت کا ذکر اس طرح کرتی ہیں:

''مردولا سارا بھائی۔ میری عزیز ترین دوست، ستائیس سال کی ساتھی، ہر کام، دکھ اور پریشانی کی شریک، 27 اکتوبر 1974ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ یادوں کے اس قبرستان میں ایک نئی قبر کا اضافہ ہوگیا۔ روز ہی بقول مولانا رومؒ کوئی نہ کوئی شاخ معطل کر دی جاتی ہے۔ اور ؎

از ردم سوئے ہستی ہر زماں

ہست یارب کارواں در کارواں

آنے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن کچھ ایسی ہستیاں بھی اس دنیا میں آئی ہیں جنہیں جاننے والے بھی بعض اوقات اجنبی نظروں سے دیکھنے لگتے ہے اور نہ سمجھنے والے تو ہر وقت ان کی نظروں سے مشکوک ومشتبہ رہتے ہیں۔

ایسی ہی ایک شخصیت مردولا بہن کی تھی۔ اوپر سے پتھر کی طرح سخت اندر سے موم کی مانند ملائم۔ کبھی کبھار لوہے کو پگھلانے کے لئے پوری بھٹی جلانے کی ضرورت پڑتی۔ اور کبھی معمولی حرارت سے دریا رواں ہو جاتا۔ (ایضاً، ص۔85)

چند جملوں میں خاکہ نگار نے اپنے موضوع کی شخصیت کو قاری کے سامنے پیش کر دیا ابتداء میں ہی قاری مردولا کی شخصیت سے متاثر ہو جاتا ہے اور ایک نشست میں پورا خاکہ پڑتا ہے۔ بیگم انیس قدوائی کا کمال فن یہ ہے کہ وہ قاری کو ابتداء ہی میں اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ شخصیت سے متعلق واقعات بیان کرتی ہیں۔ وہ کہیں کہیں معمولی سی بات میں بھی انداز تحریر سے جان ڈال دیتی ہیں ان کا اسلوب قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ مصنفہ نے خاکہ لکھتے وقت قلم سے کیمرے کا کام لیا ہے۔ انہوں نے شخصیت کی ہو بہو تصویر اس طرح پیش کی ہے کہ اس کے تمام احساسات وجذبات بھی سامنے آجائیں۔ وہ اپنے خاندانی نوکر جمن کا تعارف یوں کراتی ہیں:

> غالباً 16ء کا زمانہ تھا، جب ایک دن ہمارے ہوٹل نما مکان میں ایک اجنبی مہمان کی آمد پر ہلچل مچ گئی۔ یہ مہمان بالکل ہمارے لئے اجنبی سہی، مگر میرے والد کے اور گھر کے دوسرے بزرگ افراد کے لئے کچھ ایسا غیر معروف بھی نہ تھا۔ لوگ بڑھ چڑھ کر اس سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ مصافحہ کر رہے تھے اور ہم نئی نسل کے لوگ حیران اس کھیسیں نکالے ہوئے عجیب سے نو وارد کو دیکھ رہے تھے، جو آٹھ سال کی گمشدگی کے بعد کلکتے کی مسجد میں اپنے بڑے بھائی کو دستیاب ہو گیا تھا۔ بھائی کے لوگ اسے روپیٹ بھی چکے

تھے۔اوراس کے سویم کا فاتحہ بھی کر دیا۔میرے والد بہت
خوش تھے، جیسے کوئی نعمت عظمیٰ مل گئی ہو۔مہمان نے زنان
خانے کی ڈیوڑھی کا رخ کیا،مگر پردہ نشین ماں نے حکم
دیا''ان سے کہہ دو باہر ہی رہیں۔اندر آنے کی ضرورت
نہیں میں سامنے نہ آؤں گی۔دنیا جہان گھوم کر اب لوٹے
ہیں۔''لوگوں نے پکار کر کہا''جمن آئے ہیں۔''اور
انہوں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر آواز دی''بہو جی سلام''کوئی
جواب نہ پا کر مکرر ارشاد فرمایا۔نوکرانی نے کہا دعا کہہ رہی
ہیں بی بی اور پوچھتی ہیں اتنے
دنوں کہاں رہے۔؟ کہاں مارے مارے پھرتے
رہے۔؟ یہ مرنے کا خط کس نے لکھا تھا۔؟ ہنس کر جواب دیا
''وہ تو میں نے ایسے ہی لکھ دیا تھا دیکھوں مجھے کوئی یاد بھی کرتا
ہے یا نہیں۔ویسے ادھر ادھر گھومتا
رہا۔بمبئی،امراوتی،مونگیر،راج گیر،آبو پہاڑ سب گھوم آیا
۔''اندر سے پھر سوال ہوا۔''بھائی کو کیسے ملے۔ہم
لوگوں کو یقین ہی نہ تھا کہ تم آ گئے ہو۔اسی لئے تو ان
کو بھیجا تھا۔''ہنس کر بولے''وہ تو ویسے ہی تار دے دیا
تھا،آواز سن کر بھائی نے پکڑ لیا''(ایضاً،ص۔108)

خاکہ نگار نے اپنے موضوع، جو ان کے خاندان ہی کا ایک نوکر ہے اس کا تعارف ایسے دلچسپ انداز میں کرایا ہے کہ قاری خوب محظوظ ہوتا

ہے۔منظرنگاری خاکہ نگاری کا اہم جز ہے اور بیگم انیس قدوائی اس فن میں ماہر ہیں۔وہ اس طرح منظر کھینچتی ہیں کہ پورا نقشہ ہی سامنے آجاتا ہے ۔ساتھ ہی وضاحت بھی کرتی ہیں جیسے اس اقتباس میں جہاں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ پردے کا کتنا اہتمام تھا کہ مالکن قدیمی نوکر سے بھی اس لئے پردہ کررہی ہیں کہ وہ دنیا جہان میں گھوم کر آیا ہے۔اسی طرح جمن کے ناموں کا ذکر کیا ہے:

''اس نووارد کے کئی نام تھے،جمن،ابراہیم براہی،جمیل الدین وغیرہ ان گنت ناموں میں سے جمن ان کی ماں کا رکھا ہوا نام تھا اور براہی شاید ابراہیم کا مخفف۔

ان کی آمدنی کوئی معمولی نہ تھی۔میرے والد کے تو وہ دودھ شریک بھائی تھے ہی،ہم سب کے بھی دوست بن گئے۔والدین مرچکے تھے، بھائی کے گھر دو چار دن رہ کر واپس آگئے اور خاندان کے ایک فرد کی طرح رہنے لگے۔اب تو روز ہی سفر کے قصے، بزرگان دین کی حکایتیں،قرآن خوانی کے ساتھ نوکر اور نوکرانیوں میں فتنہ وفساد ان کا مشغلہ بن گیا۔آخر کار بہت سعی وسفارش اور والد مرحوم کے اصرار پر میری ماں نے ان کو اندر آنے جانے کی اجازت دے دی۔کیونکہ ان کا خاندان اسی گھر کا لے پالک تھا۔سب ہی بیویاں ان کے سامنے ہوتی تھیں اور مہمان آنے والی ہر بیوی پردے کی اوٹ سے جھانک کر خود دیکھ لیا کرتے تھے۔خواتین اکثر برا مان جاتیں اور ہم

کواس نامعقول حرکت کی معذرت کرنا پڑتی۔مگر وہ اپنی عادت سے
باز نہ آتے۔''(ایضاً،ص۔109)

بیگم انیس قدوائی کا فن واضح طور پر حافظ جمن کے خاکے میں نظر آتا ہے۔اس میں انہوں نے جمن کی خوبی اور خامی کو غیر جانب داری سے بیان کیا ہے۔حاجی جمن کی خوبیوں کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح اجاگر کرتی ہیں۔وہ جمن کے چہرے مہرے ،رنگ روپ،قد کاٹھی اور پہناوے کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور غیر معمولی صفات کا بیان اس طرح کرتی ہیں:

''گہرا سانولا بلکہ کسی قدر کالا رنگ،،دبلا پتلا جسم،انتہائی
بدصورت،سوکھے ہوئے پیر،لانبا کرتہ اور تہہ بند پہنے ہوئے۔حافظ
جمن جب یہ کہتے کہ اگر میرے پاس پیسہ ہوتو میں خود کسی شاہ زادی یا
راجہ کی بیٹی سے شادی کرسکتا ہوں،تو ہم سب جھلا اٹھتے،ذرا آئینہ
لے کر اپنا منہ دیکھو،اس صورت پر کون شاہ زادی تم سے شادی
کرے گی،مگر وہ بضد ہوجاتے کہ دولت ہوتو وہ ان پر عاشق ہوسکتی
ہے۔اللہ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔ایسا ہوسکتا ہے۔لڑکیاں
بگڑ بگڑ کر انہیں کوستیں اور وہ ہنس ہنس کر
انہیں جلاتے۔(ایضاً،ص۔111)

بیگم انیس قدوائی کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک ایک واقعہ کو مؤثر انداز میں بیان کرتی ہیں چہرہ نگاری کی طرح واقعہ نگاری میں بھی

مہارت دکھائی ہے اور معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی پر اثر الفاظ میں خاص ترتیب سے اس طرح بیان کر دیا ہے کہ صاحب خاکہ کی زندگی اور شخصیت کا پورا پرتو قاری کے پیش نظر ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ حافظ جمن کے مٹھائی کے شوق کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتی ہیں:

''مٹھائی کے اس حد تک شوقین تھے کہ دھوکے بازی بھی حلال سمجھتے تھے۔ والد مرحوم کے غریب اور مفلوک الحال موکل اور احباب کئی کئی دن یہاں ٹھہر کر اور مفتی مقدمے بازی سے سیر ہو کر گھر واپس جاتے تو اپنے یہاں کے مخصوص تحفے، پھلوں کے ٹوکرے، مٹھائی کی ہانڈیاں انہیں تحفتاً بھیجتے۔ پھلوں کی جھابیاں تو اندر تک سہی سلامت پہنچ جاتی تھیں مگر مٹھائی بلا ان کی دست برد کے اندر نہ جا سکتی تھی۔ بلکہ اکثر طالب علم لڑکوں کو بہلا پھسلا کر پیسے جمع کرتے اور لانے والے کو کرایہ یا مزدوری دے کر رخصت کر دیا جاتا۔ مٹھائی باہر ہی کھل کر ''حساب دوستاں در دل'' ہو جاتی۔'' (ایضاً، ص۔112)

بیگم انیس قدوائی نے کئی جگہ حافظ جمن کے مٹھائی کے شوق کو بے ساختگی سے بیان کیا ہے۔ جمن کے مٹھائی کے شوق کو پڑھ کر اچانک ذہن پریم چند کی کہانی ''ہولی کی چھٹی'' کی طرف پہنچ جاتا ہے، جس میں انہوں نے ایک بچے کے گڑ کھانے کے شوق کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

بیگم انیس قدوائی کا اپنا الگ انداز ہے اور خاکے کی ابتداء

انہوں نے مختلف انداز میں کی ہے۔انہوں نے خاکے کا آغاز کہیں شخصیت کے تعارف سے کیا ہے اور کہیں چہرے مہرے کے بیان سے اور کہیں وہ ایک دور اور زمانے کا ذکر کرتی ہیں ۔ڈاکٹر سید عابد حسین کی شخصیت سے وہ بے انتہا متاثر تھیں ۔ان کی بیوی اور مشہور ادیبہ صالحہ عابد حسین ان کو بہن کی طرح عزیز رکھتی تھیں مصنفہ ڈاکٹر عابد حسین کے خاکے کی ابتداء اس طرح کرتی ہیں:

''وہ ایک دور تھا، جب قوم پرستی کی ٹکسال میں انسان گڑھے جاتے تھے۔ جب ہماری تعلیم گاہیں اہل علم و دانش سے بھرپور تھیں۔ جب حصول علم کا مقصد صرف سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں پر پہنچنا رہ گیا تھا، مگر چند پھرے دانشور اس کو بکاؤ چیز نہ سمجھ کر گوشۂ عافیت ڈھونڈھ رہے تھے۔ ساتھ ہی سیاسی افق پر انسان دوستی اور درویشی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔

ایسے میں مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور گاندھی جی نے جامعہ ملیہ کے نام سے دولت وزر سے بے پروا، آرام وراحت سے بے نیاز ،محنت وکام کے شوقین اور تن من دھن سے تعمیر ملت ووطن میں جٹ جانے والے نوجوانوں کو ایک علمی میدان فراہم کیا، ان میں سے کوئی ابتدائی تعلیم کا ماہر تھا، تو کوئی ایڈلٹ ایجوکیشن کا شیدائی۔کوئی زبان وبیان کا ماہر تھا، تو کوئی ماہر تعمیرات۔کسی کے دماغ میں حدیث وفقہ کا نور فروزاں تھا، تو کسی کے اندر فلسفہ وہیئت کی کاوشیں۔ یہ سب صرف

ہندوستان کے قصبوں اور دیہاتوں ہی سے نہیں غیر ملکوں سے بھی آ کر
یہاں اکھٹے ہوئے تھے تا کہ ایک عدیم النظیر برادری قائم کر
سکیں۔ان میں بچوں کے شاعر بھی تھے اور بچوں کے
سدھار وسرپرستی کا سودار کھنے والی خاتون
بھی۔(ایضاً،ص۔(ایضاً،ص۔113)

مصنفہ نے پورے ایک عہد ایک دور سے متعارف کراتے ہوئے اہل علم ودانش کا خوبی کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ان کی ترجیحات سے بھی باور کرایا ہے۔ان کے مقصد کو اجاگر کیا ہے اور یہ بھی ذہن نشین کرایا ہے کہ مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر سید عابد حسین نے گاندھی جی کے ساتھ مل کر جامعہ ملیہ کو کھڑا کرنے میں کس قدر محنت کی اور آرام وراحت کو چھوڑا۔اور ان میں سے سب اپنے اپنے میدان میں ماہر تھے۔یہ خاکہ بیگم انیس قدوائی نے عابد حسین کے انتقال کے بعد لکھا ہے۔وقت گزرتا رہا ایک ایک شمع جنہوں نے ہزاروں چراغروں کو روشن کرنے کا انتظام کر دیا تھا بجھتی گئی ۔مصنفہ نے عابد حسین کو پہلی مرتبہ جب دیکھا تو وہ کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے ان کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب صاف نظر آرہے تھے۔خاکہ نگار عابد حسین سے پہلی ملاقات کا ذکر اس طرح کرتی ہیں:

''میں نے 1947ء میں انہیں پہلی بار جامعہ کی خانقاہ میں فرش پر
بیٹھے ہوئے، کتابوں اور کاغذوں سے گھرے ہوئے

دیکھا تھا۔ فاؤسٹ کے مترجم اور مشہور افسانہ نویس صالحہ عابد حسین کو دیکھنے، ملنے اور قربت کی خواہش جامعہ ملیہ لائی۔ لیکن یقین مانیے عابد صاحب کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ عالم تصور میں نہ جانے ان کا حلیہ کیا تھا۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے اس منحنی جسم میں سب کچھ دکھاوے کا ہے، صرف دماغ ہی دماغ ہے۔ باعمل متحرک، باشعور اور مقناطیس کی طرح منظر اور پس منظر کو کھینچنے والا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ انجمن جامعہ ملیہ ہو یا مجلس منتظمہ علمی و ادبی محفل ہو یا گھریلو نشست، عابد صاحب کسی جگہ ان فٹ نہ تھے۔ ان کی ہمہ دانی، تاریخ، ادب، مذہب، سیاست، کھیل کود اور لطائف وظرائف سب پر بھاری رہتی تھی۔ ان کی صائب رائے اکثر معاملات کو سلجھانے اور مسئلوں کو حل کرنے میں مدد و معاون بن جاتی تھی 54ء تک ان سے جب تک ملنے کا اتفاق رہا، ان کی معلومات سے فائدہ اٹھانے والوں میں پرانی اور نئی نسل کے بیشتر افراد شامل تھے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی عابد صاحب دماغ تھے، عقل تھے، علم تھے لیکن مجھے بہت دن بعد معلوم ہوا کہ وہ صاحب دل بھی ہیں، ایک درد مند حساس دل، جس میں دوسرے جذبات کا انتہائی احترام بھی موجود ہے اور انہیں کسی کی تعلیم کی فکر ہے، کسی کی شادی اور غم سے بھی متاثر ہیں۔ وہ ایک فرد کے نہیں کنبے کے سرپرست بھی ہیں۔ (ایضاً، ص۔118)

خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو فنکارانہ انداز میں بیان کرنا خاکے کی اہم خصوصیت ہوتی ہے۔لیکن ان خامیوں کے بیان کا انداز نصیحت آمیز نہ ہو یا مذاق اڑانے جیسا نہ ہو بلکہ خامی اس طرح بیان کی جائیں کہ سامنے والے کو محسوس بھی نہ ہو اور بات بھی پہنچ جائے۔بیگم انیس نے اس خاکے کی اس خوبی کو فنکارانہ انداز میں برتا ہے کہ بات بھی سامنے آ گئی اور عبارت بھی متاثر نہیں ہونے پائی۔بیگم انیس قدوائی نے جہاں عابد حسین کی خوبیوں کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے وہی ان کی خامی کی طرف اس طرح اشارہ کرتی ہیں:

''ان کی زبان کی کمی اکثر صالحہ بہن پوری کرتی تھیں اور سوچتی ہوں کتنا بڑا نقصان ہوتا اگر انہیں صالحہ جیسی بیوی نہ ملی ہوتی۔''(ایضاً،ص۔119)

خاکہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ شخصیت کی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے خوبی کی جانب آ جاتی ہیں اور قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے موضوع سے متعلق کسی خامی کا ذکر کیا ہی نہیں:

''مزاج میں اتنا صبر وسکون اور ٹھہراؤ تھا کہ انتہائی اشتعال انگیز گفتگو میں بھی کبھی کوئی تلخ جملہ نہ کہا۔میں کبھی کبھار اپنا دکھڑا اپنے مسائل لے کر ان کے پاس گئی ہوں،ان دنوں تو اکثر معاملات پیش رہتے تھے۔جب تعلیم وترقی سے میرا تعلق تھا اور جامعہ کے نام سے

سوشل ویلفیئر کا ایک پروجکٹ حاصل کیا تھا۔مخالفت وموافقت کے
اس ہنگامے میں درمیانی راستہ نکالنے والے اکثر عابد صاحب ہوا
کرتے تھے۔میں نے اپنی کتاب ''آزادی کی چھاؤں''انہیں پیش
کی۔یہاں انہیں پڑنے کا موقع نہ ملا۔مسودہ اپنے ساتھ جرمنی لے
گئے۔اور وہاں سے لکھ کر اپنی رائے بھیجی۔وہ کوئی اتنا اہم کام نہ تھا
جسے جرمنی کی مصروفیت میں یاد رکھتے۔لیکن دل دہی اور دلداری تھی
جس نے''گوشۂ چشمے بما کنند'' کی طرف متوجہ کر دیا۔''(ایضاً،ص۔
(119

بیگم انیس قدوائی کے خاکوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ زیر بحث شخصیت کو زندگی اور سماج سے جوڑ کر دیکھتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کے قلم سے ایسے بامعنی جملے نکلتے ہیں جن کا تعلق نہ صرف ایک شخص سے بلکہ پوری سماجی زندگی اور تہذیب سے ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں مختلف تہذیب کا سنگم ملتا ہے۔

ان کے خاکوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ صرف کسی شخص کا خاکہ نہیں لکھتیں بلکہ اس شخص کے اردگرد جو سماجی اور تہذیبی حصار ہیں اس سے بھی واقف کراتی ہیں کیونکہ جزئیات نگاری خواتین کی فطرت میں ہوتی ہے،جس سے خاکہ تجرد نہ ہوکر مفصل ہوجاتا ہے،جس کی تفصیل میں تاریخ ،تہذیب ،ثقافت اور معاشرت سبھی بولنے لگتے ہیں۔بیگم انیس کے خاکے میں ماضی کا

تذکرہ ہوتا ہے، حال کا بیان بھی ہوتا ہے، اور مستقبل کی کرن بھی نظر آتی ہے۔ مصنفہ نے عابد حسین سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''میری آخری ملاقات بہت ہی مایوس کن تھی۔ لکھنؤ جاتے ہوئے یہی سوچتی رہی کہ اب شاید ہی ملنا ہو سکے۔ عجیب اتفاق کہ اس دن خواجہ احمد عباس کی بہن بھی موجود تھیں، عابد صاحب کو نیند کی دوا مل چکی تھی اس لیے زیادہ وقت انہیں سے بات کرنے میں گزرا۔ ارواس طرح اس دن راہ عدم کے دو مسافروں سے ملنا ہوا۔ ان میں ایک لب دم تھا اور ایک تندرست مگر تندرست نے قدم پہلے اٹھا دئے۔ اللہ کی مرضی۔

جامعہ نئے ہاتھوں میں ہے۔ نئے زمانے کے نئے عزائم ہوں گے ۔لیکن کچھ بڑی بات نہ ہوگی اگر ماضی کے جھروکے سے آنے والی روشنی کو بھی چراغ راہ بنالیا جائے اور یہ روزن بند نہ کئے جائیں۔'' (ایضاً، ص۔120)

اس طرح یہ خاکہ سید عابد حسین سے بیگم انیس قدوائی کی پہلی ملاقات سے شروع ہو کر آخری ملاقات پر ختم ہو جاتا ہے۔ درمیان میں بہت سے واقعات ہیں جس کو مصنفہ نے بڑی روانی سے بیان کیا ہے۔ بیگم انیس کے یہاں طنز و مزاح کا رنگ بھی ہے، ان کے خاکوں کو ان کے شوخ لہجے نے مؤثر بنا دیا ہے۔

فنی لحاظ سے بیگم انیس قدوائی کے خاکے اہم ہیں، جن میں شوخ اور

ہلکے رنگ کی پیچیدگیاں بھی ہیں اور طنز و مزاح کا رنگ بھی۔انہوں نے تیرہ لوگوں کے خاکے لکھے یہ ان لوگوں کے خاکے ہیں جن سے وہ ذاتی طور پر بے حد متاثر تھیں۔ان خاکوں کے اسلوب میں تازگی ہے۔انہوں نے خاکوں میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ روزانہ بول چال کے الفاظ ہیں مگر ان انداز استعمال انہیں ندرت و جاذبیت سے مزین کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی:

1۔آزادی کی چھاؤں میں از بیگم انیس
قدوائی،سود لیتھو پریس دہلی،سنہ
اشاعت۔1974

2۔اب جن کے دیکھنے کو از بیگم انیس قدوائی،مکتبہ
جامعہ لمیٹڈ،سنہ اشاعت۔1980

3۔اردو ادب میں خاکہ نگاری از صابرہ
سعید۔اعجاز پرنٹنگ پریس،حیدرآباد،سنہ
اشاعت۔1978

4۔نظرے خوش گذرے از بیگم انیس قدوائی
،نعمانی پرنٹنگ پریس دہلی،سنہ اشاعت۔1976